اجتہاد

تصور و حقیقت

طالب محسن
ریسرچ سکالر، المورد، ادارہ برائے علم و تحقیق، لاہور

ہمارے اس زمانے میں بطور خاص جب سے مغرب کا سیاسی اور نظریاتی غلبہ ہوا ہے اجتہاد کا لفظ اپنے نئے تصور اور اطلاق کے ساتھ سامنے آیا ہے۔

یہ جملہ ہمیں کئی بار سننے اور پڑھنے کو ملا کہ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہے۔ یہ جملہ بھی بارہا حیطہ گوش و نگاہ میں آیا کہ روز روز نئے احوال پیش آتے ہیں اور ان میں ہمیں اجتہاد کی ضرورت ہے۔ سمع و بصر نے اس نوازش سے بھی بہرہ پایا کہ دین میں اصولی احکام دیے گئے ہیں اور اطلاق و تفریع کا کام اس کے ماننے والوں کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس دائرے میں ہمیشہ اجتہاد جاری رہے گا۔ ہم نے یہ بھی پڑھا اور سنا ہے کہ اجتہاد کے دروازے بند ہیں اور دین کی تشریح، تفریع اور اطلاق کا جو کام ہونا تھا اپنے کمال کو پہنچ چکا ہے اور اب کسی نئے کام کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس کشاکش کے باوجود یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ روایتی علماء ہوں یا جدید تعلیم یافتہ اہل علم سب ہی کسی نہ کسی صورت میں فرض اجتہاد ادا کر رہے ہیں۔

اجتہاد کیا ہے؟

اجتہاد کا لفظ ایک اور معنی میں سامنے آتا ہے جب دور اول کے فقہاء یا بعد میں فقہائے اصولیین کے لیے مجتہد کا لفظ بولا جاتا ہے۔ ان کا کام اصل میں دین کی تدوین یعنی اس کے اجزا کی تعیین، تفہیم اور درجہ بندی ہے۔ مآخذ کا تعین ہے اور پھر ان مآخذ کے باہمی تعلق کی تحقیق و تعیین ہے۔ پھر ماخذ کے فہم اور اس سے استنباط و استشہاد کے اصول و قواعد کو معین کرنا ہے۔ ان کے ہاں نئے مسائل کے حوالے سے فتاوی موجود ہیں لیکن یہ ان کے اصل کام کا بہت ہی محدود حصہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خود دین کا ادراک، اصول و مبادی کا فہم، مقاصد و اہداف کا عرفان، شرائع و احکام کا شعور اور نصوص سے استنباط اور اس کے اطلاق کی صلاحیت بہم پہنچانا بذات خود ایک پورا کام ہے اور اس کے لیے جس محنت کی ضرورت ہے اس کے لیے بجا طور پر اجتہاد کا لفظ بولا گیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا اس اجتہاد کی اب ضرورت ہے۔ امت میں رائج نقطہ نظر یہ ہے کہ اس اجتہاد کی اب ضرورت نہیں ہے۔ دین کیا ہے۔ اس حوالے سے جتنے کام کی ضرورت تھی وہ دور تدوین میں مکمل ہو گیا اور اس حوالے سے اب کسی کام کی ضرورت باقی رہی ہے اور نہ اس صلاحیت کے لوگ ہیں۔

ایک اعتبار سے یہ جواب درست ہے۔ اس لیے کہ نقل دین کا عمل تاریخ کے ایک خاص موقع ہی پر ہونا تھا اور وہ کام اس دور میں مکمل ہو گیا جسے ہم دور تدوین کہتے ہیں۔ اس کام کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ یہ ہے کہ حضور ﷺ سے جو دین جاری ہوا وہ بے کم وکاست بیان ہو جائے۔ اس کے عقائد بھی اور اس کے اعمال بھی۔ اس کے فرائض بھی اور اس کے نوافل و مستحبات بھی۔ نہ صرف یہ کہ دین ایک علم کے طور پر منتقل ہو بلکہ اس کے احوال وظروف، رسوم واوضاع اور مطالب و معانی بھی پوری طرح امت کے اذہان و مزاج کا حصہ بن جائیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس دائرے میں جو کچھ بھی علمی سرگرمی ہوگی وہ دور صحابہ سے متصل زمانے کے لوگوں کے کام پر منحصر ہے اور فطری طور پر اسی پر منحصر رہے گی۔ یہ کام انھی کا حصہ تھا اور بعد کے لوگ نہ اس میں ان کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں اور نہ ان کی جگہ لے سکتے ہیں۔

اس کام کا دوسرا حصہ وہ ہے جس میں فقہ، حدیث، تفسیر سے متعلق فنون پیدا ہوئے ہیں۔ اس کام کا بڑا حصہ اگرچہ بعد کے زمانے میں اپنی حاصل صورت میں سامنے آیا لیکن اس کی نمو اور خدوخال اسی دور میں وجود پذیر ہو گئے تھے جسے ہم دور تدوین کہتے ہیں۔ یہاں بھی سوال یہ ہے کہ کیا نئے اصول تفسیر مرتب ہو سکتے ہیں۔ کیا نئے اصول فقہ یا نئے اصول حدیث تشکیل دیے جا سکتے ہیں۔ اس حوالے سے بھی عمومی جواب یہی ہے کہ اس معاملے میں بھی امت میں دریافت کا عمل اپنے اتمام کو پہنچ چکا ہے اور اس میں کسی اضافے یا ترمیم کی ضرورت نہیں۔

مزید برآں اس نقطہ نظر کے حاملین یہ یقین رکھتے ہیں کہ اگر ان دونوں دائروں میں کسی تبدیلی کی جدوجہد کی گئی تو وہ ہدایت کے بجائے گمراہی پر منتج ہوگی۔ چنانچہ وہ اس سلسلے میں ہونے والی مساعی کو امت کے راہ صواب سے انحراف قرار دیتے ہیں اور اس طرح کی مساعی کے علمبرداروں کو گمراہ اور گمراہ کرنے والے قرار دیتے ہیں۔

اجتہاد کی ایک صورت وہ ہے جس کا ذکر معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو میں موجود ہے۔ یہ روایت اگرچہ فن روایت کی رو سے کمزور روایت ہے لیکن اس سے بہرحال ایک طریقہ و منہاج ہمارے سامنے آتا ہے۔ ترمذی میں ہے:

عن رجال من اصحاب معاذ ان رسول الله بعث معاذا الی الیمن فقال کیف تقضی فقال اقضی بما فی کتاب الله قال فان لم یکن فی کتاب اللّٰہ قال بسنة رسول اللّٰہ قال فان لم یکن فی سنة رسول اللّٰہ قال اجتهد رایی قال الحمد للّٰہ الذی وفق رسول رسول اللّٰہ

''حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں میں سے کچھ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ کو یمن پر مامور کیا تو پوچھا: تم کیسے فیصلے کرو گے۔ انھوں نے کہا: میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ فرمایا: اگر کتاب اللہ میں نہ ہو؟ کہا: پھر اللہ کے رسول ﷺ کے طریقے پر۔ پوچھا: اگر رسول ﷺ اللہ کے طریقے میں نہ ہو؟ کہا: میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ فرمایا: شکر ہے اس اللہ کا جس نے اللہ کے رسول ﷺ کے نمائندے کو توفیق بخشی''۔

روایت کے الفاظ سے بالکل واضح ہے کہ اس میں فیصلہ کرنے کا معاملہ زیر بحث ہے۔ میری مراد یہ ہے کہ یہاں اصلا دین بتانے کا معاملہ زیر بحث نہیں ہے۔ مکالمے میں پیش نظر نظام حکومت چلانے میں دین کی روشنی میں فیصلے ہیں۔ دین بتانے میں تو جو دین ان کو معلوم تھا اسے بے کم وکاست بیان کرنا ہے۔ حضرت معاذ ان صحابہ میں سے ہیں جن کو حضور ﷺ سے لمبی مصاحبت کا شرف حاصل ہے اور جن کی صلاحیت اور دینی ذوق کے سبب حضور ﷺ ان کی تربیت کا خصوصی اہتمام فرماتے تھے۔ اس لیے دین کے معاملے میں ان سے یہ سوال کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ مزید یہ کہ جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے فیصلہ کرنے کا لفظ دین کے بیان کے لیے موزوں بھی نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ نے ان سے اصلا عدالتی اور حکومتی فیصلوں کے حوالے سے بات کی ہے لیکن ظاہر ہے وہ وہاں ایک حاکم اور قاضی کے طور پر ہی نہیں جا رہے تھے وہ ایک معلم کی حیثیت بھی رکھتے تھے لہذا دین کے حوالے سے آراء دینا بھی اس میں شامل ہے۔ بہرحال فیصلہ کرنے میں انھوں نے قرآن، حدیث وسنت اور اپنے فہم سے مدد لینے میں ایک ترتیب بیان کی ہے۔ اور اسی ترتیب پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مدح کی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اجتہاد کا یہ دائرہ اصل میں دین کے اطلاق کا دائرہ ہے۔ اس دائرے میں ہمارے روایتی علما بھی اجتہاد کے قائل ہیں۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جہاں ایسے مسائل سے سابقہ پیش آئے گا جہاں دین کا کوئی براہ راست حکم موجود نہیں ہے وہاں اجتہاد کیا جائے گا۔ اولاً ان اجتہادی آراء کو اختیار کیا جائے گا جو ائمہ مجتہدین نے پہلے سے دے رکھی ہیں۔ اور اگر کہیں نئی رائے قائم کرنی پڑے گی تو ان اصول فقہ کے تحت اختیار کی جائے گی جن کا تعین ان ائمہ نے پہلے سے کر دیا ہے۔

یہ تصویر کا ایک رخ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ امت تفسیر، فقہ، کلام اور تذکیر کے دائروں میں علم وعمل کے دونوں پہلوؤں سے دریافت، تبیین اور ترویج کے مراحل سے گزر چکی ہے۔ اہل علم کا کام یہ ہے کہ وہ ان کا فہم حاصل کریں اور اگلی نسلوں تک اس کی بے کم وکاست منتقلی میں اپنا کردار ادا کریں۔

اس تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔ دور اول کے فقہا کا منہج فکر زیادہ عملی و اطلاقی ہے۔ چنانچہ ان کی زیادہ کاوش اس رخ پر تھی۔ وہ اس عملی منہج پر قائم رہے جو حضور ﷺ اور صحابہ کے عملی اسلوب سے رائج ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کی تصانیف میں ہمیں حضور ﷺ کے عمل اور صحابہ کے فتاوی سے استناد کا رجحان غالب نظر آتا ہے۔ مزید برآں اس دور کی ایک نمایاں بات یہ بھی ہے کہ حکم کا فہم بھی عملی حوالے سے ہے۔ میری مراد یہ ہے کہ اس کے اطلاقی پہلو کو دیکھا جاتا ہے اور اطلاق میں کیا اصول کارفرما ہے اس کو طے کر کے اس کے توسیعی اطلاق کی راہ نکالی جاتی ہے۔ اس میں مجموعی دین کا فلسفہ وحکمت طے کر کے اس کی روشنی میں انفرادی حکم کی نوعیت طے کرنے کا رجحان ہمیں نظر نہیں آتا۔ ممکن ہے اس کی کچھ مثالیں مل جائیں لیکن یہ اس دور کی نمائندگی نہیں کرتی۔ اس لیے کہ عمومی رجحان وہی ہے جس کا تذکرہ ہم نے کیا ہے۔

امام شافعی نے متن حدیث کی فوقیت کا رجحان پیدا کیا اور بعد ازاں محدثین کے کام نے متن حدیث کی فوقیت کو مستحکم کرنے میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔ اس کے نتیجے میں فقہ اور اصول فقہ میں تبدیلی آئی۔

اموی اقتدار سیاسی پیشوائی کا اہل تھا لیکن دینی پیشوائی کی نشست خالی ہوگئی۔ جس کے نتیجے میں فقہا اور مصلحین ایک مقبول اور مؤثر طبقے کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ اس چیز نے مذہب کے انفرادی رجحانات کو پنپنے کا موقع

دیا اور خانقاہی نظام کے لیے بھی راہ ہموار کی۔ اس کے بعد یونانی اور مسیحی علم کلام سے مواجہہ نے نئے فکری رجحانات پیدا کیے۔ اس کے نتیجے میں دین کا مطالعہ فلسفیانہ رنگ میں ہونے لگا۔ اس دور میں دین کو محض مجموعہ اوامر ونواہی کے طور پر دیکھنے کے بجائے ایک کل کے طور پر دیکھنے کا رواج پیدا ہوا۔ اس رجحان نے پہلا ظہور تصوف کی صورت میں کیا۔ اس رجحان نے اگرچہ فقہ میں اہل فقہ سے موافقت کی لیکن امت میں یہ عمومی رنگ پیدا ہو گیا کہ حقیقت دین صوفیا کے پاس ہے اور فقہا ظاہر دین کے علم بردار ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ فقہا کے پیرو علما کی بڑی اکثریت نے اس دوئی کو اپنا لیا اور ابن حنبل کے انداز کو رواج حاصل نہ ہو سکا کہ دین کے معاملے میں صرف بیان نصوص تک محدود رہا جائے۔ اس عمومی رجحان کے خلاف سب سے طاقتور آواز امام ابن تیمیہ کی سنائی دیتی ہے۔ بتدریج انھیں مقبولیت حاصل ہوئی اور اب امت کا ایک بڑا حصہ ان کے فکر سے متاثر ہے۔

امام ابن تیمیہ کے علاوہ ایک بڑی شخصیت شاطبی کی ہے۔ جو ان تمام رجحانات کو سامنے رکھ کر فقہ، اصول فقہ اور کلام میں ایک متوازن راہ بنانے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے بعد ایک بڑا نام شاہ ولی اللہ کا ہے۔ شاہ ولی اللہ اگرچہ مغربی علوم و افکار سے واقف نہیں تھے اس کے باوجود ان کی کتاب حجۃ اللہ البالغۃ اس آنے والے زمانے کا نقطۂ آغاز معلوم ہوتی ہے۔

مغرب سے واسطہ پڑنا ایک مختلف واقعہ ہے مغرب کی یلغار محض سیاسی نہیں تھی بلکہ ایک نظریاتی یلغار بھی تھی۔ جس کے نتیجے میں تقریباً تمام مسلمان معاشرے نظریاتی توڑ پھوڑ کا شکار ہوئے اور اس کے نتیجے میں تفسیر اور فقہ میں نئے مکاتب فکر سامنے آئے۔

ہمارا پہلا واسطہ یونانی فکر سے پڑا یہ محض فکری یلغار تھی۔ ہمارا دوسرا واسطہ چنگیزیوں سے پڑا وہ محض سیاسی یلغار تھی۔ ہمارا تیسرا واسطہ مغربی اقوام سے پڑا لیکن یہ سیاسی اور فکری یلغار تھی۔ پہلے دونوں مرحلے اس لیے کم نقصان دہ ہوئے کہ ان میں مذہب کے لیے بطور مذہب کوئی چیلنج نہیں تھا۔ لہٰذا ہم نے فکر و عمل میں کچھ اضافے کیے اور بتدریج وہی تازہ بیانات ہمارے روایتی بیانات بن گئے۔

اس ساری تفصیل سے مقصود صرف یہ دکھانا ہے کہ یہ تصور عملاً بے معنی ہے کہ دین کے کسی بھی دائرے میں اجتہاد نہیں ہے۔ اس امت کے تمام ادوار میں مختلف عوامل اس بات کے داعی ہوئے کہ دین کسی نہ کسی پہلو سے نئے بیان کے مرحلے سے گزرا ہے اور ہر زمانے میں اس نئے بیان کو توحش کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ نقل دین کا عمل بظاہر لگتا ہے کہ زمانے کے الٹ پھیر سے محفوظ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ لفظ اور عمل کی منتقلی میں امت نے غایت درجہ احتیاط سے کام لیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید ایک محفوظ کتاب کے طور پر امت کے ہاتھ میں موجود ہے۔ نماز اور حج اور متعدد دوسرے اعمال بھی اپنی اصل صورت میں تسلسل کے ساتھ قائم ہیں۔ حضور ﷺ کے ارشادات اور اسوہ کے حوالے سے بھی اس امت نے پوری کوشش کی ہے کہ جس حد تک ممکن ہے صحت کے ساتھ محفوظ ہو جائے۔ اس کا فہم و ادراک بھی ایک حد تک تسلسل کے ساتھ اجماع وتواتر سے منتقل ہوتا آرہا ہے۔ لیکن یہی وہ دائرہ ہے جہاں مفسرین، فقہا، متکلمین اور مرتبین نے اپنے اپنے انداز میں کام کیا ہے اور مسلسل ہوتا چلا آرہا ہے۔

دین کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں پہلی بات یہی کہی جائے گی کہ اس کے مشمولات ہمیشہ سے ایک ہیں اور یہی رہیں گے۔ یہ اجتہاد کا موضوع نہیں فہم کا موضوع ہیں۔ ان میں نہ ترمیم ہو سکتی ہے نہ اضافہ۔ جو عقائد اور ان کا فہم اور جو اوضاع اور صورتیں حضور ﷺ نے جاری کیں، انھیں بعینہ قائم رکھنا اور قائم کرنا اس امت کی ذمہ داری ہے۔ اس حوالے سے تحقیق واجتہاد کا ہدف صرف یہ ہے کہ اصل دین کو محفوظ، مفہوم اور معمول بہ رکھا جائے۔ مختلف فکری اور عملی داعیات نے اس اصل دین کے حوالے سے جہاں جہاں اہل اسلام کو متاثر کیا ہے وہاں وہاں اصل کے احیا کی کوشش کی جائے۔ اوپر بیان کی گئی تفصیلات کو ذہن میں رکھیں تو اس کا ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ پہلے یونانی، مسیحی اور ہندی اور اس آخری زمانے میں مغربی اثرات نے جو انحرافات پیدا کیے ہیں انھیں سمجھا جائے اور پھر تلافی مافات کا سامان کیا جائے۔

دوسرا دائرہ وہ ہے جہاں اسی دین کے اطلاق کے حوالے سے احوال وظروف کی تبدیلی سے نئے فتاوی کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ وہ دائرہ ہے جہاں اس امت کا کوئی گروہ دوسری رائے نہیں رکھتا۔ یہاں ہر ایک اجتہاد کو جائز ہی نہیں بلکہ ضروری قرار دیتا ہے۔ البتہ پہلے دائرے میں اجتہاد کا لفظ متجددین استعمال کرتے ہیں۔ ہم نے واضح کیا ہے کہ یہاں مساعی کا ہدف تجدید واحیا کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

ابراھیمی مذاہب
میں
نظریۂ علم اور تفسیرِ نصوص

ڈاکٹر محسن نقوی
سابق رکن اسلامی نظریاتی کونسل